آج اگر قرآن مجید کی موجودگی کے باوجود مسلمانوں کو سرنگ کی دوسری طرف روشنی دکھائی نہیں دیتی تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے درمیان وحی کی عظمت کے مقابلے میں علماء وفقہاء کی عظمت کہیں زیادہ مستحکم ہوگئی ہے۔ ہم قرآن مجید کے راست مطالعے اوراس سے اپنا چراغِ فکر روشن کرنے کے بجائے یہ ضروری خیال کرتے ہیں کہ ہمارے اس خیال کی تائید علمائے قدیم کے اقوال سے ہوتی ہے یا نہیں۔

مسلم فکر میں انقلاب کی ضرورت

مسلمان اس وقت جس بحرانِ عظیم سے دوچار ہیں اس کی شدّت کا اندازہ کچھ اس سوال سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہر خاص و عام کسی نہ کسی لب ولہجہ میں اس خلجان کا اظہار کررہا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ قرآن مجید کی موجودگی کے باوجود ہمیں من حیث الامّہ سرنگ کی دوسری طرف کوئی واضح روشنی دکھائی نہیں دیتی۔ جس امت پر سیادتِ عالم کا فریضہ عائد کیا گیا ہے وہ قرآن مجید کی موجودگی اور علماء ومفسرین کے سلسلۂ درس وارشاد کے باوجود سخت نظری بحران میں کیوں مبتلا ہے۔Auschwitz میں اہل یہود پر جوگزری اس کے بعد ان کے یہاں بھی اس سوال نے شدت سے سر اٹھایا تھا کہ خدا اپنی برگزیدہ قوم کو آخر کس طرح بے یارومدد گار چھوڑسکتا ہے۔ یہودی علماء اور دانشور اپنے آپ سے پوچھا کئے کہ اگر دنیا سے قوم یہود کا اسی طرح صفایا ہوگیا تو تاریخ کی معنویت کیا رہ جائے گی؟ اہل یہود جو عرصہ ہائے دراز سے تاریخ میں جینے کے خوگر ہیں وہ اب تک اس حقیقت کا ادراک کرنے میں ناکام رہے ہیں کہ دنیا کی سیادت سے ان کی معزولی عمل میں آگئی ہے۔ اہل یہود اور مسلمانوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک کی معزولی الٰہی فیصلہ ہے جبکہ امت مسلمہ کا زوال تاریخ کا ایک ایسا انحراف ہے جس کی درستگی کی ترکیب آخری وحی کی روشنی میں عین ممکن ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ صورتِ حال کا صحیح تجزیہ کرنے اور وحی ربانی کی روشنی میں اپنی گم کردہ راہوں کو منور کرنے کے بجائے مسلمان وحی کے بجائے تاریخی اسلام کے اسیر ہوگئے ہیں جس کی وجہ سے انہیں اپنے زوال اور تاریخ کے انحراف کا صحیح اندازہ لگانے میں سخت دشواری پیش آرہی ہے۔

دنیا اس وقت اپنی تاریخ کے بدترین بحران سے دوچار ہے۔ Development کے نام پر غیر منصوبہ بند طریقے سے مختلف ملکوں میں جو کچھ ہوتا رہا ہے اور جس طرح مختلف تنگ نظر مفاد پرست گروہوں نے دنیا کو اپنی مٹّھی میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے اس کے نتیجہ میں اس وقت عالمی سطح پر انسانیت ایک غیر یقینی مستقبل سے دوچار ہے۔ ماحولیات کی تباہی، دنیا کی دولتوں کا چند ہاتھوں میں ارتکاز، بین الاقوامی کمپنیوں کی اجارہ داری، ذرائع ابلاغ کے ذریعہ فکر ونظر کی آزادی کا چھن جانا اور انسانوں کو وہی کچھ دیکھنے اور سننے پر مجبور کرنا جو دنیا کی چند بڑی قوتیں یا بااثر ٹولہ چاہتا ہے، یہ سب کچھ ایک ایسی صورت حال ہے جس سے نکلنے

کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ خدا بیزار پالیسی ساز ذہن نے پوری دنیا کو ایک ایٹمی بھٹّی میں تبدیل کر دیا ہے۔ انسانوں کی فکری اور مادی توانائی زندگی کے بجائے موت کی تیاری میں صرف ہو رہی ہے۔ ایسی صورت حال میں توقع تھی آخری وحی کے علمبردار انسانیت کے بے سمت قافلے کی رہنمائی کے لیے سامنے آئیں گے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ خیرِ امت کے تمام تر دعووں کے باوجود امّت مسلمہ خود اپنے وجود کی لڑائی میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ دنیا کی موجودہ بے سمتی تمام ہی خدا ترس نفوس سے رہنمائی کا مطالبہ کر رہی ہے۔ البتہ اگر مسلمان بھی دوسری قوموں کی طرح اس چیلنج کو قبول کرنے کا یارا نہیں رکھتے تو پھر آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے ان کا وجہ ٔ امتیاز کیا رہ جاتا ہے؟

گذشتہ دنوں مذاہب کی عالمی پارلیامنٹ میں شرکت کی غرض سے مجھے اسپین جانے اور وہاں مونٹ سراٹ کی چوٹی پر ایک عیسائی خانقاہ میں قیام کا موقع ملا۔ اسی خانقاہ میں چند سکھ رہنما اور منی پور کے ایک پنڈت جی بھی قیام فرما تھے۔ میں نے یہ دیکھا کہ صبح اندھیرے منھ اٹھ کر خاصی دیر تک محترم پنڈت جی کسی سفید رنگ سے بصد احتیاط اپنی پیشانی کو ناک تک مزّین کرتے رہے یہاں تک کہ ان کے چہرے بشرے سے مذہبی رہنما ہونا واضح ہو گیا۔ دوسری طرف ایک سکھ بزرگ ایک طویل کپڑے کو ٹھیک کرنے میں اپنے احباب کی مدد لے رہے تھے تاکہ وہ مذاہب کے عالمی اجتماع میں باندازِ سکھ اپنی نئی پگڑی کے ساتھ شرکت کر سکیں۔ اس عالمی اجتماع میں طرح طرح کے مذہبی لباس اپنی جاہ وشکوہ کا اظہار کر رہے تھے۔ عیسائی راہبوں کا مخصوص لباس ‘اہل یہود کی مخصوص ٹوپی’ برہما کماریوں کی سفید ساڑیاں اور بعض مسلم علماء کا ملبوسِ ریگستانی۔ کسی نے اپنے نام کے آگے ہز ہولی نیس His Holiness لکھ رکھا تھا تو کسی کو Reverend یا فادر کے لاحقے پر اصرار تھا‘ کوئی ربائی تھا تو کوئی مولانا‘ اور کسی نے بہ صد احتیاط اپنے نام سے پہلے امام لکھنا مناسب سمجھا تھا۔

خدا شناسوں کے اس اجتماع میں لباس کی غیر معمولی تزئین اور احتیاط پر سخت حیرت بلکہ کوفت ہوئی۔ میں نے اپنے ہمسایہ پنڈت جی سے پوچھا اہل مذاہب کے اس عالمی اجتماع میں ہر ایک کو اپنے مخصوص لباس پر اتنا اصرار کیوں ہے؟ بہت کچھ بحث وتمحیص کے بعد وہ دل کی بات بلا تکلف زبان پر لے آئے۔ کہنے لگے دراصل لوگ رشد وہدایت کے لیے ہماری طرف دیکھتے ہیں۔ وہ ہمیں عام انسانوں سے الگ رول ماڈل کے طور پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ ظاہر کی یہ تمام آرائش دراصل ان کے اسی مطالبے کے پیش نظر ہے۔ ورنہ حقیقی بندگی سے بھلا لباس کا کیا تعلق۔ رسوماتِ بیجا کے اس اہتمام میں صرف پنڈت جی کو ہی موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ تقریباً تمام ہی مذاہب کے رہنماؤں نے عوام الناس سے اپنے آپ کو ممتاز کرنے کے لیے ایسے لباس کو اختیار کر رکھا ہے جس سے ان کا مذہبی یا خدا شناس ہونے کا فی الفور اور بہ نظرِ اول پتہ چل سکے۔ عام انسانوں کے لیے یہ ادراک کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس بھاری بھرکم لباسِ تقویٰ میں گوشت پوست کا کوئی عام انسان سانس لے رہا ہے جس کی فہم وبصیرت پر تنقیدی نگاہ بھی ڈالی جا سکتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب رومی افسران حضرت مسیحؑ کی گرفتاری کے لئے آئے تھے تو ان کے لئے حواریوں کی مجلس میں حضرت مسیحؑ کی شناخت مشکل ہوگئی تھی۔ انہیں جوڈا کے بوسۂ تعظیم کا سہارا لینا پڑا تھا۔ حضرت مسیحؑ تو پھر بھی ایک برگزیدہ نبی تھے خود محمدؐ رسول اللہ کے متبعین کا یہ حال تھا کہ انہوں نے کبھی بھی اپنے لئے کسی مصنوعی اور ظاہری وجہ امتیاز کو گوارا نہیں کیا۔ مدینہ کی گلیوں میں باہر سے آنے والے غیر ملکی وفود خلیفۂ وقت حضرت عمرؓ کی بابت پوچھا کرتے اور انہیں یہ جان کر سخت حیرت ہوتی کہ ہٹو بچو سے دور معمولی سے لباس میں خلیفۂ وقت ان سے مخاطب ہے۔ پہلی نسل کے مسلمان حریتِ فکر کی لذت سے آشنا تھے۔ وہ اس بات سے خوب واقف تھے کہ خدا کی نگاہ میں تمام انسان برابر ہیں۔ قیادت کی ذمہ داری یا رشد و ہدایت کا منصب کسی کو عام انسانوں کی سطح سے اٹھا کر تقدس کے منصب پر فائز نہیں کرتا۔ عام مسلمان اپنے قائدین اور اہل علم پر تنقیدی نگاہ ڈالنا اپنا حق سمجھتے۔ حتی کہ عین خطبہ کے دوران ایک اعرابی عورت خلیفۂ وقت کو ٹوک دینا اپنا حق سمجھتی۔ دوسری طرف قائدین اور اہل علم بھی اپنے آپ کو گوشت پوست کا عام انسان سمجھتے اور اپنے لئے کسی مافوق الفطری القاب کو گوارہ نہیں کرتے اور نہ ہی عام مسلمان اس خیال کے قائل ہوا کرتے کہ وہ اپنے ہی جیسے لوگوں کو تقدس کے ہالے میں گھرا دیکھ سکیں۔ مسلمانوں میں حریتِ فکر کی روایت جب تک باقی رہی ان کی نگاہیں اصحاب علم وفن سے ماوراء، وحی کے اوراق میں ہدایت کی طالب رہیں۔ البتہ جب سے اصحاب علم وفن نے اپنے آپ کو عام انسانوں سے الگ ایک مقدس مخلوق کی حیثیت سے پیش کرنے کی طرح ڈالی اور ان کے ناموں کے آگے پیچھے تقدس مآب القاب وآداب کی طویل قطار وجود میں آنے لگی مسلم ذہن پر تقلید کی دھند دبیز ہوتی گئی۔

آج اگر قرآن مجید کی موجودگی کے باوجود مسلمانوں کو سرنگ کی دوسری طرف روشنی دکھائی نہیں دیتی تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے درمیان وحی کی عظمت کے مقابلے میں علماء وفقہاء کی عظمت کہیں زیادہ مستحکم ہوگئی ہے۔ ہم قرآن مجید کے راست مطالعے اور اس سے اپنا چراغِ فکر روشن کرنے کے بجائے یہ ضروری خیال کرتے ہیں کہ ہمارے اس خیال کی تائید علمائے قدیم کے اقوال سے ہوتی ہے یا نہیں۔ جن لوگوں کو قرآن کا طالب علم ہونا چاہئے تھا انہوں نے القاب وآداب کے سہارے مخصوص مذہبی لباس کے جاہ وحشم میں خود کو religious authority باور کرا رکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہمارے یہاں احبار ورہبان کا ایک طبقہ پیدا ہوگیا ہے۔ آخر اس حیرت انگیز مماثلت کا سبب کیا ہے کہ جس طرح اہل یہود کے علماء خود کو ربائی کہلواتے اور خود کو خدا صفتی کا حامل سمجھتے ہیں اور جس طرح عیسائی علماء نے اپنے لئے Father یا آسمانی باپ کی اصطلاح اختیار کر رکھی ہے، جو صرف خدائے واحد کو زیب دیتا ہے، اسی طرح مسلم علماء نے بھی اپنے لئے مولانا کا لقب اختیار کر رکھا ہے جو خود قرآن مجید میں خدائے وحدہٗ لاشریک کے لئے استعمال ہونے والی اصطلاح ہے۔ جب قومیں اپنے اہل علم کو تقدس کے ہالے میں گھرا دیکھنے کی عادی ہوجاتی ہیں اور جب عام انسانوں کے ذہن پر یہ بات نقش ہوجاتی ہے کہ خود ان کے درمیان بعض لوگوں کا

اندازِ فکر تقدس سے عبارت ہے جس پر تنقیدی نگاہ نہیں ڈالی جاسکتی تو حریتِ فکری کا چراغ گل ہو جاتا ہے۔ ایسی قومیں بحران کے لمحات میں مسائل کا نیا حل ڈھونڈنے اور وحی کی تجلیوں سے اپنی راہوں کو ازسرِ نو منور کرنے کا حوصلہ کھو دیتی ہیں۔ پھر مذہب کے نام پر ہونے والا سارا کاروبار دراصل مذہب کی نفی کرتا رہتا ہے۔ بائبل میں علمائے یہود اور فریسیوں پر حضرت مسیح کی سخت تنقید اسی خیال کی تائید کرتی ہے۔ خود قرآن مجید میں رسول اللہ کی دعوت کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہنا کہ آپؐ لوگوں کی گردنوں کو اصر و اغلال سے نجات دلاتے ہیں، دراصل اسی خیال کو ذہن نشین کرانا ہے کہ خدا نے اپنے دین کی تشریح و تعبیر کا حق کسی طبقہ مخصوص کو نہیں دے رکھا ہے اور یہ کہ محمد رسول اللہ کی دعوت انقلاب کسی ربائیت، پاپائیت یا مولویت کے ادارے کو برداشت نہیں کرسکتی۔ سچی مذہبیت اور خدا ترسی اس بات کی کیسے اجازت دے سکتی ہے کہ اہل تقویٰ اپنے لئے شرکیہ القاب و آداب کا استعمال روا رکھیں اور جھوٹے تقدس کی یہ غیر صحت مند روایت حریتِ فکر و نظر کا چراغ گل کر دے۔

خدا کے نزدیک اہل یہود ہوں یا ہم مسلمان ہماری فوقیت کا بنیادی سبب تمسک بالکتاب تھا۔ اہل یہود جب تک تورات کو تھامے رہے، تمام اقوامِ عالم پر ان کی فضیلت قائم رہی۔ لیکن جب انہوں نے تورات کے گرد احبار و رہبان کی خودساختہ تاویلات کے پہرے بٹھا دیئے اور جب ان کی مذہبی زندگی میں وحیٔ تورات کے بجائے احبار و رہبان کی فقہ، مشناۃ و گمارا کے مجموعوں اور ملفوظات و ظائف پر مشتمل کتابوں کو کلیدی اہمیت حاصل ہوتی گئی تو ان کا تعلق وحیٔ ربانی سے ٹوٹ گیا۔